رضوان اللہ

[۱]

سیدنا ابراہیم حضرت نوح کی اولاد ہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ علم کی دنیا میں ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہ حقیقت جس طرح کتابِ تورات کے اندر بیان ہوئی ہے[۱]، اسی طرح قرآن میں بھی مکمل طور پر اس کی تصدیق ہوئی، یہاں تک کہ اس میں ایک اہم استدلال کی بنیاد بھی اس پر اٹھائی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ. ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌۚ. (آل عمران ۳: ۳۳-۳۴)

”اس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ سمیع و علیم ہے۔“

اگر اس آیت کو موضوعیت سے بالکل پاک ہو کر پڑھا جائے تو یہ بات ہر طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ سیدنا ابراہیم حضرت نوح کی نسل میں سے ہیں، اس لیے کہ اس میں بتادیا گیا ہے کہ یہ سب لوگ ایک دوسرے کی اولاد ہیں، یعنی نوح آدم کی اولاد ہیں، آل ابراہیم نوح کی اور آل عمران آل ابراہیم کی۔ تاہم، آیت کے اس متبادر مفہوم پر بھی بعض حضرات نے آج کے دور میں کچھ سوالات اٹھادیے ہیں اور وہ لوگ اس بات کے درپے ہوئے ہیں کہ چند موہوم احتمالات کی بنیاد پر اس تاریخی حقیقت کا مطلق انکار کر دیں۔ ہم قرآن مجید کے طالب علم ہیں،

۱۔ پیدایش ۱۱: ۱۰-۲۶۔

چنانچہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے جیسے طالب علموں کے لیے اس آیت کو اب مزید کھول کر بیان کریں اور اس کے لیے توضیح کے وہ اسالیب اختیار کریں کہ اس پر اٹھائے گئے سوالات کا جواب بھی آپ سے آپ ہو جائے۔

سب سے پہلے اس آیت میں دو چیزوں کی وضاحت ہو جانی چاہیے: ایک 'ذُرِّيَّة' کا لفظ اور دوسری 'بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ' کی ترکیب۔

ذُرِّيَّة

عربی زبان میں اس لفظ کے اصل معنی کسی شخص کی اولاد کے ہیں۔ اسے قرآن میں کئی مقامات پر اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ اس آیت میں:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً. (الرعد ۱۳: ۳۸)

''ہم نے، (اے پیغمبر)، تم سے پہلے بھی رسول بھیجے اور (چونکہ انسان ہی تھے، اس لیے) ان کو بیویاں بھی دیں اور اولاد بھی۔''

لفظ کے اسی معنی کا اطلاق ہے کہ یہ عربی زبان میں کم عمر والی اولاد، یعنی بچوں کے لیے اور بعض اوقات بڑی عمر کی اولاد، یعنی نوجوانوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں استعمالات کی مثالیں بالترتیب یہ ہیں:

ألا لا تقتلن ذرية، قيل: لم يارسول الله، أليس هم أولاد المشركين؟ قال: ''أوليس خياركم أولاد المشركين''. (نسائی، رقم ۸۶۱۶)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو، بچوں کو ہر گز قتل نہ کرو۔ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ، کیوں نہ قتل کریں، کیا وہ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم میں سے جو بہتر ہیں (کہ آج اسلام لے آئے ہیں)، کیا وہ بھی کل تک مشرکین کی اولاد نہ تھے؟''

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ. (یونس ۱۰: ۸۳)

''مگر موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے اُس کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہیں مانا کہ کہیں فرعون انھیں کسی فتنے میں نہ ڈال دے۔''

کبھی یہ چھوٹے بچوں کے ساتھ اُن کے وجود کا سبب بننے والی عورتوں کو بھی محیط ہو جاتا ہے۔ اس روایت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں حضرت سعد بن معاذ نے اسے اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے:

إني أحكم أن تقتل المقاتلة وأن تسبى الذرية. (بخاری، رقم ۳۰۴۳)

”میرا فیصلہ ہے کہ مقاتلین کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قید کر لیا جائے۔“

’ذُرِّيَّة‘ کا ایک معنی ”نسل“ بھی بتایا جاتا ہے۔ یہ اس لفظ کا اصل میں دوسرا معنی نہیں، بلکہ یہ اولاد کے سلسلے کی ایک دوسرے لفظ کے ساتھ تعبیر ہے۔ البتہ، نسل کے اس مفہوم کو بنیاد بناتے ہوئے بعض اوقات اسے جنس اور نوع کے لیے بھی برت لیا جاتا ہے۔ اول الذکر کی مثال یہ آیت ہے:

لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۶۲)

”اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اُس کی تمام نسل کو چٹ کر جاؤں گا۔“

ثانی الذکر کی مثال اس آیت میں ہے:

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ. (یٰس ۳۶: ۴۱)

”اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ ان کی نسل کو ہم نے (ان سے) بھری ہوئی کشتیوں میں اٹھا رکھا ہے۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان مثالوں کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ’ذُرِّيَّة‘ کا اصل مطلب اولاد ہے اور یہ مطلب اُس کے تمام اطلاقات میں ایک جزو لاینفک کی طرح موجود رہتا ہے[۲]۔ لغت کی کوئی کتاب یا عربی ادب کی کوئی نظیر، ہماری نظر سے ایسی نہیں گزری جس میں اس کا معنی اولاد کے اس مفہوم سے بالکل مجرد کر کے صرف ”لوگ“، یعنی الناس بتایا گیا ہو۔ سو جن حضرات نے آج اس کے لیے ”لوگوں“ کا لفظ استعمال کیا ہے، اُنھیں اصل میں سورۂ یٰس کی مذکورہ آیت میں ’ذُرِّيَّتَهُمْ‘ کی اضافت سے مغالطہ ہو گیا ہے، دراں حالیکہ اس لفظ سے بھی ابنائے نوع، یعنی آدم کی اولاد ہی مراد لی گئی ہے۔ اب ہم اردو بولنے والوں کے لیے یہ تو روا ہے کہ ہم اس مفہوم کو ”اُن کے لوگوں“ کے الفاظ میں ادا کریں کہ اردو میں ”لوگوں“ کا لفظ ”اُن کے“ کی اضافت کے ساتھ بیان نوع کے لیے بھی آ جایا کرتا ہے، لیکن اس کے لیے محض ”لوگوں“ کا لفظ لانا کسی طرح بھی درست

۲۔ دیکھا جائے تو اردو کا لفظِ ”اولاد“ بھی اپنے معنی اور اپنے اِطلاقات میں عربی کے ’ذُرِّيَّة‘ سے بڑی حد تک مماثل ہے۔

نہیں ہے جو 'الناس' کا مفہوم دیتا اور اس طرح 'ذُرِّيَّة' میں سے اولاد کے مفہوم کو بالکلیہ خارج کر دیتا ہے۔

بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ

اس ترکیب میں پایا جانے والا 'مِنْ' عام طور پر ابتدا کے لیے ہوتا ہے [۳]۔ اور یہ ابتدا مجازی معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور حقیقی معنی میں بھی۔ اور مزید یہ کہ اس میں بعض سے پہلے ایک مضاف بھی محذوف ہوا کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت میں ذیل کی آیات غور طلب ہیں:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ط بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ. (النساء ۴: ۲۵)

"اللہ تمھارے ایمان سے خوب واقف ہے۔ تم سب ایک ہی جنس سے ہو۔"

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ. (التوبہ ۹: ۶۷)

"منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک ہی طرح کے لوگ ہیں۔"

ان آیات میں 'بَعْض' سے پہلے ایک مضاف، یعنی جنس کا لفظ محذوف ہے اور 'مِنْ' بھی یہاں ابتدا کے لیے آیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلی آیت میں حقیقی اور دوسری آیت میں یہ اپنے مجازی معنی میں آیا ہے۔ مجازی معنی میں اس لیے کہ یہاں پیش نظر اس مدعا کو بیان کرنا ہے کہ منافق مرد اور منافق عورتیں ہم مشرب اور ایک دوسرے کے موافق ہیں، نہ کہ اُن کے بارے میں یہ بتانا کہ وہ آپس میں نسب کا کوئی تعلق اور ناتا رکھتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری بات جو اس ترکیب کے بارے میں سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس میں دونوں طرف سے ہونے کا مفہوم اصلاً موجود نہیں ہوتا، بلکہ اس کے متعلق کلام سے نتیجے کے طور پر اس میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی جماعت کے بعض افراد کے لیے جب یہ کہا جائے کہ وہ دوسرے افراد کی جنس میں سے ہیں تو اس کا مطلب، ظاہر ہے یہی ہو گا کہ دوسرے بھی پہلوں کی جنس میں سے ہیں۔ اسی طرح جب بعض افراد کے بارے میں کہا جائے کہ وہ دوسروں کے مماثل یا اُن کے دوست ہیں تو نتیجے کے لحاظ سے دوسرے بھی اُن کے مماثل اور دوست ہی کہلائیں گے۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اس ترکیب میں کون سا لفظ محذوف ہے؟ کیا اس میں دونوں طرف کا معنی

۳۔ یہ ابتدا وہ نہیں ہے جو اپنی غایت بھی رکھتی ہے، بلکہ یہ مبدا کے معنی میں آتی ہے، جیسا کہ اس آیت میں: 'لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ' (الواقعہ ۵۶: ۵۲)۔

پیدا ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے تو وہ کس لحاظ سے ہوا ہے؟ ان تمام باتوں کا فیصلہ اس ترکیب کے متعلقات اور جس سیاق و سباق میں یہ آئی ہو، اُس کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مقدم الذکر آیت میں جب مسلمانوں کو غلام عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی تو اُس وقت کے عرب معاشرے کی رعایت سے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ وہ عورتیں چاہے غلام ہیں، مگر خدا پر ایمان رکھتی ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ تم میں سے کون کس قدر ایمان والا ہے۔ اسی طرح وہ غلام ہیں تو کیا ہوا، 'بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ'، آخر تم سب ایک دوسرے کی جنس، یعنی ایک باپ کی اولاد ہو۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس ترکیب میں اگر ''جنس'' کا مضاف اور دونوں طرف سے برابری کا مفہوم پیدا ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سیاق میں عورت اور مرد کا ذکر اور آزاد و باندی کے درمیان میں نکاح کرنے کا مضمون آیا ہوا ہے۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ اس ترکیب اور 'حسين مني وأنا من حسين' کے اسلوب میں کوئی مماثلت نہیں ہے، جیسا کہ ان حضرات کو اس کا خیال ہو گیا ہے۔ بلکہ اس روایت میں جو 'من' آیا ہے، وہ اصل میں ابتدا کے بجائے تبعیض کا ہے۔[۴] اس تبعیض میں اتصال کا مفہوم پایا جاتا ہے جو نتیجے کے لحاظ سے محبت اور تعلق اور کبھی مماثلت جیسے مضامین کو محیط ہو جایا کرتا ہے[۵]۔ اور یہ وہی اسلوب ہے جو مثال کے طور پر، قرآن نے ذیل کی آیت میں استعمال کیا ہے:

فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّيۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيۡٓ. (البقرہ ۲: ۲۴۹)

''جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں ہے اور جس نے اس ندی سے کچھ نہیں چکھا، وہ میرا ساتھی ہے۔''

بہر کیف، 'ذُرِّيَّة' کا لفظ اور 'بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ' کی ترکیب واضح ہو جانے کے بعد اب ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

آیت کی تفہیم

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ. ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا

۴۔ اس تبعیض کے بعض معنوی استعمالات ہماری اپنی زبان میں بھی پائے جاتے ہیں، جیسا کہ کلیجے کا ٹکڑا، جگر پارہ وغیرہ۔

۵۔ اس روایت میں یہ مماثلت کے لیے ہر گز نہیں آئی، جیسا کہ ان حضرات کو اس کا بھی خیال ہو گیا ہے۔ یہ محبت کے اظہار کے لیے آئی ہے، مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مِنۡ بَعۡضٍ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ.(آل عمران ۳: ۳۳-۳۴)

''اس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ سمیع و علیم ہے۔''

اس آیت میں 'بَعۡضُهَا مِنۡ بَعۡضٍ' میں آنے والا 'مِنۡ' اپنے مبدا کو بیان کر رہا ہے اور اس ترکیب کا حصہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہے۔ البتہ، اس ترکیب کے بارے میں یہ سوال ضرور اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے حقیقی معنی میں آئی ہے یا مجازی معنی میں؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس احتمال کو ہم کسی درجے میں مان سکتے تھے کہ یہ مجازی معنی میں آئی ہو اور صرف یہ بتا رہی ہو کہ حضرات آدم و نوح اور آل ابراہیم و آل عمران، سب ہم مشرب اور آپس میں ایک جیسے ہیں[6]۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر 'ذُرِّيَّة' کا ایک لفظ آ گیا ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ اس ترکیب کا مجازی معنی مراد لیا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ 'بَعۡضُهَا مِنۡ بَعۡضٍ' کا موصوف ہے اور اسے کسی صورت مہمل نہیں چھوڑا جا سکتا، بلکہ ضروری ہے کہ یہ اپنی صفت، یعنی اس ترکیب سے متعلق ہو اور اس کے معنی کی تعیین کرے۔ دوسری صورت میں یہ لفظ ساری بات سے غیر متعلق ہو کر رہ جائے گا اور سامع کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا کرے گا کہ اس جملے میں اولاد کا ذکر کیوں ہوا اور اولاد سے مراد آخر کس کی اولاد ہے؟[7] سو اس لفظ کے زیر اثر اس ترکیب کی تالیف کچھ یوں بنتی ہے: 'بعضها من نسل بعضیا بعضها من ذرية بعض'۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسے یہاں اس کے حقیقی معنی میں برتا گیا ہے اور اس کا مطلب اب یہی ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اگر سیاق و سباق کو بھی ملا لیا جائے جو حضرت مسیح کی الوہیت کا انکار کر رہا اور آپ کو مریم کے گھر میں جنم لینے والا ایک انسان بتا رہا ہے تو اس ترکیب میں مجاز کے ہر پہلو کی مطلق نفی اور اس کے حقیقی ہونے کی اور زیادہ تاکید ہو جاتی ہے۔

اسی لفظِ ''اولاد'' کے ہوتے ہوئے اب یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ اس ترکیب میں دونوں طرف کا مفہوم برابر کی حیثیت سے مانا جا سکے، اس لیے کہ یہ عقلاً بھی اور عملی طور پر بھی بالکل محال ہے کہ بعض افراد ایک دوسرے

۶۔ بلکہ اگر یہی بات کہنا ہوتی تو زیادہ مناسب یہ تھا کہ صرف 'بعضهم من بعض' کہہ دیا جاتا، اور 'ذُرِّيَّةً بَعۡضُهَا مِنۡ بَعۡضٍ' کا ''پیچ دار اسلوب'' ہرگز اختیار نہ کیا جاتا۔

۷۔ اور وہ مہمل جملہ یہ بنتا ہے: ''خدا نے آدم و نوح اور آل ابراہیم و آل عمران، یعنی اولاد کو چنا جو سب ایک جیسے ہیں۔''

کی اولاد ہو سکیں۔ چنانچہ اس میں اب دونوں طرف کا مفہوم فقط اس قدر ہو گا کہ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ باپ اور اولاد کا رشتہ رکھتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد اب آدم و نوح اور آل ابراہیم و عمران، ان سب کے متعلق یہ آپ سے آپ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات ایک ترتیب سے ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔ یہ ترتیب کس طرح سے ظاہر ہوئی ہے، اس کے بارے میں، البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ خاص اس ترکیب سے نہیں، بلکہ اس کے متعلقات اور اُس علم کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جس کی رعایت سے اس کلام کا صدور ہوا ہے۔ ہماری بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن مجید کے ایک اسلوب کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کی تعیین جان بوجھ کر نہیں کی جاتی اور اُسے سامعین کے علم، اُن کی ذہانت اور عقل عام پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً اس آیت میں فرمایا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى. (البقرہ ۲: ۱۱۱)

”یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، جب تک وہ یہودی یا نصرانی نہ ہو۔“

یہاں اہل کتاب کا اپنے بارے میں ایک دعویٰ بیان ہوا ہے، مگر یہ بیان اس طرح سے ہوا ہے کہ قرآن کے اسالیب سے ناواقف کوئی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ اہل کتاب کے دونوں گروہ بحیثیت مجموعی یہ دعویٰ کیا کرتے تھے اور اِس سے اُن کی مراد یہ ہوتی تھی کہ جنت میں صرف ہم دونوں، یعنی یہود اور نصاریٰ جائیں گے، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر فریق دوسرے کو جنت کا مستحق سمجھنا تو بڑی دور کی بات، وہ دین کے معاملے میں اُس کی کوئی جڑ بنیاد ہی نہ مانتا تھا۔ اصل میں قرآن کے پیش نظر یہ بات کہنا تھا کہ ”یہود کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، جب تک وہ یہودی نہ ہو اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، جب تک وہ نصرانی نہ ہو۔“ لیکن اُس نے اِس بیان کے لیے لف کا اسلوب اختیار کیا ہے اور اپنے مخاطب کی ذہانت اور اہل کتاب کی باہمی عداوت کے بارے میں اُس کے علم پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی بات کو ہر دو فریق کے اعتبار سے الگ سے متعین نہیں کیا۔

اسی طرح کا معاملہ زیر بحث آیت میں ہوا ہے۔ صاحب ”کشاف“ نے ’ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ‘ کے فقرے کو آل ابراہیم اور آل عمران کا اور دوسرے نحوی حضرات، جیسا کہ العکبری وغیرہ نے اسے ’نُوْحًا‘ سمیت تینوں کا بدل قرار دے لیا ہے، اور پھر اسی روشنی میں آیت کے معنی کی تعیین کرنے کی کوشش کی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مگر ہماری راے میں اول تو اسے بدل کے بجاے حال قرار دینا چاہیے کہ یہی کلام کے سیاق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ دوسرے جا اس حال کے ذوالحال اور پھر آیت کے مطلب کی تعیین محض جملے کی نحوی تالیف سے کرنے کے بجاے مذکورہ بالا اسلوب کی روشنی میں کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہاں متکلم کی طرف سے اس طرح کی کوئی تعیین سرے سے نہیں کی گئی، بلکہ حال کو ان تمام اسما کے مجموعہ پر لا کر اس کے معنی کی تعیین کو عقل عام، سامع کی ذہانت اور اُس کے موجود علم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب قرآن کے اس براہ راست سامع کے بارے میں تو ہم جانتے ہی ہیں کہ اُس کے لیے آدم و نوح کی شخصیات اور عمران و ابراہیم کے خانوادے ہرگز اجنبی نہیں ہیں اور نہ اسے قرآن نے پہلی مرتبہ اُن سے متعارف کروایا ہے، بلکہ وہ اُن سب سے اچھی طرح سے واقفیت رکھنے والی اُس روایت کا فرد ہے جسے مذہبی کتابوں میں لکھی ہوئی شہادتوں کی بھی بھرپور تائید حاصل ہے [8]۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے کانوں میں ابھی تک اکیسویں صدی میں ہونے والے ''انکشاف'' کی بھنک بھی نہیں پڑی ہے۔ چنانچہ قرآن نے جب یہ کہا کہ ''اللہ نے ان لوگوں کو چنا، اس حال میں کہ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں'' تو اُسے اس جملے میں کسی تعیین کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی اور اُس نے بلا تامل یہ جان لیا کہ اِس کے حال کا ذوالحال کون ہے اور مزید یہ کہ یہ تمام حضرات ایک ترتیب سے ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔

بلکہ اس طرح کی بات اگر ہم اپنی زبان میں بھی اسی عدم تعیین کے ساتھ بیان کریں تو ہمارے سامعین بھی اصل مدعا کو فوراً پا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ ''خدا نے ظہیر الدین بابر، جلال الدین اکبر، شاہ جہاں اور شاہ عالم کو ہندوستان کی حکومت عطا کی اور یہ سب ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔'' تو ہمیں یقین ہے کہ ہر وہ شخص جو اردو زبان کا ادنیٰ درجے کا فہم اور ان بادشاہوں کے بارے میں واجبی سی معلومات رکھتا ہو، یہ سوال کبھی نہیں کرے گا کہ اس میں ترتیب کہاں بیان ہوئی ہے؟ اور ان میں سے کون کس کا باپ اور کون کس کی اولاد ہے؟ بلکہ ہم عرض کریں کہ اگر اِس جملے میں ان بادشاہوں کا ذکر ترتیب کے بغیر بھی کر دیا جائے تو بھی اُسے اصل مراد پانے میں لمحہ بھر کی دیر نہ ہو گی۔ بس اس میں شرط یہی ہے کہ وہ شخص منطق زدہ نہ ہو چکا ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ کہیں ''ذوق'' گزیدہ بھی نہ ہو چکا ہو۔

غرض یہ کہ اس آیت سے بالکل واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کیہ سب ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور

۸۔ اس کے لیے بائیبل میں سے یہ مقامات دیکھ لیے جا سکتے ہیں: نوح آدم کی اولاد ہیں (پیدایش ۵: ۳—۲۹)۔ ابراہیم نوح کی اولاد ہیں (پیدایش ۱۱: ۱۰-۲۶)۔ عیسیٰ ابراہیم کی اولاد ہیں (متی ۱: ۱-۱۷۔ لوقا ۳: ۳۶)۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ترتیب سے ایک دوسرے کی اولاد ہیں، یعنی نوح آدم کی، آل ابراہیم نوح کی اور آل عمران آل ابراہیم کی۔ اور اس سے یہ بھی آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم واقعتاً حضرت نوح کی اولاد ہیں۔ سو اس قدر صریح بات کے ہوتے ہوئے ضرورت تو نہیں رہ جاتی کہ اس کے خلاف رائے کو زیر بحث لایا جائے، مگر ہمارے جیسے مبتدئین کی رعایت سے شاید اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس پر بھی کچھ نہ کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔

''انکشاف'' اور اُس کے دلائل پر تبصرہ

ان حضرات نے کہا ہے کہ سیدنا ابراہیم حضرت نوح علیہ السلام کی نہیں، بلکہ اُن کے ایک صحابی کی اولاد ہیں[9]۔ اپنے اس انکشاف کو ثابت کرنے کے لیے یہ بنیادی طور پر اس آیت سے دلیل لائے ہیں:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا. ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۲-۳)

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کو انھی بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔ اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ (ہمارا) ایک شکر گزار بندہ تھا۔''

ان کا کہنا ہے کہ نوح کی کشتی میں جب اُن کی اولاد کے علاوہ دیگر مومنین بھی سوار تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں 'ذریة نوح' کے بجاے 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کیوں کہا گیا؟ اس کا مطلب ہے کہ قرآن یہاں بتانا چاہتا ہے کہ بنی اسرائیل اولاد نوح میں سے نہیں ہیں، اس لیے کہ جب کشتی میں دیگر مومنین کے ہوتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ''یہ نوح کے ہم سوار کی اولاد ہے۔'' تو اس سے مذکورہ شخص کے اولاد نوح میں سے ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کے استدلال پر کوئی تبصرہ اور اس آیت کی صحیح تفہیم عرض کریں، ہم چاہتے ہیں کہ چند باتوں کی اچھی طرح سے وضاحت کر دیں کہ جن کا اہتمام کم سے کم اللہ کی کتاب سے استدلال کرتے ہوئے ضرور کیا جانا چاہیے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس وضاحت سے قرآن کے طلبا کو جس طرح سے فائدہ ہو گا، اسی طرح اُن دلائل کی حقیقت بھی واضح ہو کر سامنے آ جائے گی جو اس رائے کے حق میں ان کی

۹۔ اسی پر بس نہیں، ان کی طرف سے اُس فرضی صحابی کا نام بھی تجویز کر دیا گیا ہے، یعنی 'عَبْدًا شَكُوْرًا'۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طرف سے ضمنی طور پر دیے گئے ہیں۔

ا۔ منشاے متکلم

فہم قرآن میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ما سیق الکلام لاجلہ معلوم کیا جائے، یعنی دیکھا جائے کہ متکلم کی طرف سے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ ان کے ذریعے سے اصل میں کس بات کا ابلاغ چاہتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے ان لوگوں کی طرف سے پیش کی گئی یہ آیت دیکھ لی جائے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ. (الانعام ۶: ۸۴)

”ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عنایت فرمائے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی۔ اس سے پہلے یہی ہدایت ہم نے نوح کو بخشی تھی اور اُس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت میں ابراہیم کی اولاد میں آنے والے انبیا کے بارے میں 'مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان حضرات نے چونکہ یہاں منشاے متکلم معلوم کرنے کا التزام نہیں کیا، اس لیے انھیں اس لفظ میں آنے والی واحد کی ضمیر سے ایک غلط فہمی ہو گئی ہے۔ انھوں نے سمجھا ہے کہ پیچھے ابراہیم اور نوح، دونوں کا ذکر ہوا ہے، اس لیے ابراہیم اگر واقعہ میں حضرت نوح کی اولاد ہوتے تو یہاں واحد کے بجاے 'من ذریتهما'، یعنی تثنیہ کے الفاظ آتے۔ سو اِس سے انھوں نے مطلب برآری کی ہے کہ ابراہیم حضرت نوح کی اولاد نہیں ہیں، حالاں کہ اس مقام پر جب غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں خدا کی طرف سے ان نبیوں کے نسب کا بیان ہرگز نہیں ہو رہا کہ اس کی رعایت کرتے ہوئے واحد اور تثنیہ کے صیغوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جاتا۔ یہاں پیش نظر ابراہیم علیہ السلام کے درجات کی بلندی کو بیان کرنا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو ہدایت دے کر قوم کے خلاف انھیں حجت عطا فرمائی اور ہم جس کو چاہتے ہیں، اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد اسی ذیل میں فرمایا ہے کہ ہم نے اُن کی اولاد میں بھی نبی بھیجے جو اس ہدایت کے حامل ہوئے۔ سو اِس کلام کی منشا و مراد جان لینے کے بعد ضمیر کے بارے میں واحد اور تثنیہ کی بات بڑی سیدھی ہو جاتی ہے۔ یعنی فضیلت کا یہ بیان چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہے، اس لیے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اسی وجہ سے 'مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ' میں واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

یہ تو ہوئی منشاے متکلم سے اعراض کے نتیجے میں برآمد ہونے والے استدلال کی حقیقت۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ اصل منشا کی روشنی میں اس آیت کو پڑھا جائے تو اس میں سے ان لوگوں کی راے بالکل برعکس، ایک لطیف سا اشارہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ نے جب سیدنا ابراہیم کے فروع، یعنی اُن کی اولاد میں آنے والی نبوت کا ذکر کیا ہے تو اُن کی فضیلت کے بیان کو ہر طرح سے کامل کر دینے کے لیے اس بیچ میں اُن کی اصل، یعنی حضرت نوح کو دی جانے والی نبوت کا بھی ذکر کر دیا ہے، اور یوں ہم جیسے طالب علموں کو یہ اشارہ دے دیا ہے کہ ابراہیم واقعتاً حضرت نوح کی اولاد ہیں۔

۲۔ اوصاف کا بیان

قرآن میں صالحین اور اشرار کا بیان ہوتا ہے تو اس کے ساتھ بسا اوقات اُن کے اوصاف کو بھی نمایاں کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود ایک سے زائد اہداف ہوا کرتے ہیں، جیسا کہ شریروں کی مخالفت اور شر پر تنبیہ اور نیکوکاروں کی حمایت اور نیکی کی ترغیب۔ یہ اوصاف بعض مرتبہ کسی کے بارے میں اس قدر تسلسل سے بیان ہوتے ہیں کہ یہ اُس شخص یا گروہ کا امتیازی وصف قرار پا جاتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں یہود اور منافقین کے لیے 'فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' کا وصف کئی مقامات پر بیان ہوا ہے اور ایک طرح سے اُن کی گویا پہچان سی ہو گیا ہے۔ اس وصف کو بیان کرنے کے پیش نظر کئی مطالب ہوتے ہیں جو ہر مقام پر الگ سے متعین کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کسی مقام پر اس کے ذریعے سے بتایا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں مرض ہے، اس لیے یہ شیطان کے حملے کا ہدف بن رہے ہیں۔ یا کسی جگہ پر واضح کیا ہے کہ ان کی طرف سے جو شرارتیں سرزد ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ ان کے دلوں کا یہی روگ ہے۔ یا کہیں اس چیز کو بیان کیا ہے کہ ان لوگوں کے دل چونکہ پہلے سے بیمار تھے، اس لیے ان کی بیماری میں اب اور اضافہ ہو گیا ہے۔ کلام کے اندر یہ لطائف، ظاہر سی بات ہے، کبھی پیدا نہ ہوتے اگر ان مقامات پر 'فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' کے وصف کے بجاے یہود اور منافقین کے الفاظ استعمال کر لیے جاتے۔ اس توضیح کی روشنی میں اب ان حضرات کی پیش کردہ ایک آیت کو دیکھ لیا جائے:

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ط اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳)

"اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ (ہمارا) ایک شکر گزار بندہ تھا۔"

قوم نوح پر آنے والے عذاب سے نجات پانے کے لیے چونکہ اس بات کو لازم قرار دیا گیا تھا کہ لوگ اُن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے ساتھ کشتی میں سوار ہوں، اس لیے قرآن نے اُن کی معیت میں سوار ہونے والوں کا وصف خصوصی طور پر نمایاں کیا ہے، اور اس قدر نمایاں کیا ہے کہ یہ حضرت نوح کے ساتھ نجات پانے والے مومنین کا تعارف، بلکہ ایک طرح سے اُن کا دوسرا نام ہو گیا ہے۔ اس کے لیے ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں: 'وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ'۔ ایک مقام پر فرمایا ہے: 'مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ'۔[10] اسی طرح مذکورہ آیت میں اس کے لیے 'مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ سو واضح ہو جانا چاہیے کہ یہ بھی وصف بیان کرنے کا ایک انداز ہے، ''گھماؤ پھراؤ'' یا ''پیچ دار قسم'' کا اسلوب ہر گز نہیں ہے، جیسا کہ ان حضرات نے اپنی رائے نہ مان لیے جانے کی صورت میں اس پر ایک طرح سے اصرار کیا ہے۔

۳۔ احتمال اور دلیل میں فرق

کسی کلام کو بادی النظر میں دیکھا جائے تو اس میں بعض اوقات ایک سے زیادہ احتمالات واقع ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے الفاظ، جملوں کی بندش اور سیاق و سباق پر اچھی طرح سے غور کیا جائے، یہاں تک کہ اُن میں سے ایک احتمال مراد کے طور پر متعین ہو جائے اور اُس ایک کے سوا باقی سب ختم ہو کر رہ جائیں۔ یہ بچ جانے والا احتمال ہی اصل میں وہ مفہوم ہوتا ہے جسے علم کی دنیا میں دلیل قرار دیا جا سکتا اور اس پر اپنے استدلال کی بنیاد اٹھائی جا سکتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں احتمال اور دلیل میں پایا جانے والا یہ فرق بالکل بھی واضح نہیں ہے، اس بات کے ثبوت میں ان کی طرف سے پیش کردہ یہ آیت دیکھ لی جا سکتی ہے:

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ. ''یقیناً اسی کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔''

(الصافات ۳۷: ۸۳)

یہاں 'مِنْ شِيْعَتِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ الفاظ اُس شخص کے لیے بھی لائے جا سکتے ہیں جو حضرت نوح سے صرف دعوت کا اشتراک اور اُس کی موافقت کا تعلق رکھتا ہو اور اُس کے لیے بھی جو دعوت کے ساتھ ساتھ اُن سے نسب کا تعلق بھی رکھتا ہو۔ ان حضرات نے ان میں سے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے اور کمال مہارت یہ ہے کہ کسی بھی دلیل کے بغیر دی ہے، حالاں کہ ان کے لیے ضروری تھا کہ یہ جس طرح اپنے مفروضہ احتمال کو خوب محکم کرتے، اسی طرح اس میں موجود دوسرے احتمال کی بھی مطلق نفی کرتے۔ اور اس کے بعد کہیں جا کر ان کے لیے یہ جائز ہوتا کہ اسے اپنی دلیل قرار دیں اور اس کی بنیاد پر علمی دنیا میں اپنے انکشافات کے

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

۱۰۔ الاعراف ۷: ۶۴ اور المومنون ۲۳: ۲۸۔

قصر تعمیر کریں۔

۴۔ دعویٰ اور دلیل میں مطابقت

جو بھی دعویٰ پیش کیا جائے، اُس میں اور اُس کے ثبوت کے لیے دی جانے والی دلیل میں پوری پوری مطابقت ہونی چاہیے۔ اس متفقہ اصول کا تقاضا ہے کہ استدلال کی ''بنت'' میں اس کا ضرور خیال رکھا جائے تاکہ نادانی میں بڑے بڑے مغالطوں کا شکار ہو جانے سے بچا جاسکے۔ اس اصول کے بر خلاف، ان حضرات کی رائے میں دعویٰ اور دلیل میں عدم مطابقت کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اس آیت کو دیکھ لیا جائے:

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ط اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳)

''اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ (ہمارا) ایک شکر گزار بندہ تھا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کا کہنا ہے کہ کشتیِ نوح میں چونکہ اُن کی اولاد کے علاوہ دیگر مومنین بھی سوار تھے، اس لیے جب یہ کہا جائے کہ ''یہ نوح کے ہم سوار کی اولاد ہے'' تو اس سے اس بات کی نفی ہو جائے گی کہ مذکورہ شخص اُن کی اولاد میں سے ہے۔ اس پر ہم عرض کریں گے کہ اول تو مثال کے طور پر پیش کیا جانے والا یہ جملہ آیت کے مطابق ہر گز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اپنے اسلوب میں بیانیہ اور عربی کا جملہ اس کے بر خلاف خطابیہ ہے اور اہل علم جان سکتے ہیں کہ اس تبدیلی سے جس تعیین کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ اصل اسلوب میں پیدا ہونے کا کم ہی اِمکان ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے دعوے اور دلیل کے طور پر پیش کی جانے والی اس آیت میں ادنیٰ درجے کی بھی کوئی مطابقت نہیں ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ''اے اُن لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بنی اسرائیل اولاد نوح نہیں ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں اس طرح کی نفی کرنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ہی وقت میں جس طرح غیر اولاد کو خطاب کرنے کے لیے درست ہیں، اسی طرح حضرت نوح کی وہ اولاد جو اُن کی معیت میں کشتی میں سوار ہوئی، انھیں خطاب کرنے کے لیے بھی بالکل موزوں ہیں اور زبان کے کسی قاعدے کی رو سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ابن حنبل کے بیٹے عبد اللہ جنھوں نے دوسرے شاگردوں کے ساتھ اپنے باپ سے حدیث کا درس لیا، اُن کی اولاد سے اس جملے میں خطاب کرنا آخر کیوں روا نہیں ہے کہ ''اے اُن لوگوں کی اولاد جو ابن حنبل سے پڑھتے رہے۔''؟ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرے گا کہ محض ان الفاظ سے اس بات کی نفی ہو گئی

ہے کہ یہ بچے عبداللہ کے نہیں ہیں؟ اور کیا وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ نتیجہ بھی نکال سکے گا کہ یہ ابن حنبل کے دوسرے شاگردوں کی اولاد ہیں؟ مختصر یہ کہ 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کا جملہ اپنی ترکیب میں اگر نوح کی اولاد اور غیر اولاد، دونوں کا اثبات کر رہا ہے تو اسے ان میں سے ایک کی نفی قرار دے دینا اصل میں دعویٰ اور اُس کی دلیل میں مطابقت نہ ہونے ہی کی ایک ''روشن'' مثال ہے۔

ان چند باتوں کی وضاحت کے بعد اب ہم ان کے استدلال کا نقص واضح کرنے کے لیے ان کی پیش کردہ آیت کی صحیح تفہیم عرض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اُن کی راے کے حق میں کسی دلیل کا ہونا تو بڑی دور کی بات، الٹا ہماری راے کی ترجیح کا ایک پہلو اس میں پایا جاتا ہے۔

آیت کی تفہیم

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا. ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۲-۳)

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کو انھی بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ، اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ (ہمارا) ایک شکر گزار بندہ تھا۔''

www.javedahmadghamidi.org

آیت میں ''مَنْ'' کا حرف آیا ہے۔ یہ واحد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے لیے بھی۔ بنی اسرائیل، ظاہر ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے کسی ایک شخص کی اولاد ہیں، مگر اس مقام پر اسے جمع میں لانا زیادہ معنی خیز ہے۔ اپنے مقصد سے غافل ہو جانے والے کسی خاندان کو اگر ہم نصیحت کرتے ہوئے کہیں: ''تم اُس شخص کی اولاد ہو جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آیا تھا۔'' یا اُن سے کہیں: ''تم اُن لوگوں کی اولاد ہو جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔'' تو دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ بات اُن سے کہی گئی ہے، اس کی رعایت سے دوسرا جملہ اپنے اندر زیادہ بلاغت رکھتا ہے۔ اگر یہ واضح ہو جائے تو اس سے یہ بات اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتی ہے کہ 'اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا' کے الفاظ میں چونکہ 'اِنَّ' کا اسم واحد ہے، اس لیے اس کا مرجع نوح کے ساتھ سوار ہونے والے اُن کے کوئی صحابی نہیں، بلکہ خود حضرت نوح ہیں، یعنی اب اس کا ترجمہ یہ نہیں ہوگا کہ نوح کے ساتھ سوار ہونے والا شخص 'عَبْدًا شَكُوْرًا' تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نوح اللہ کا ایک شکر گزار بندہ تھا۔

آیت میں 'مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ'، یعنی ''وہ لوگ جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا'' کا ایک فقرہ آیا ہے۔ اس کے الفاظ اپنے اندر پوری گنجایش رکھتے ہیں کہ ان سے صرف نوح کی اولاد مراد لی جائے یا دیگر مومنین یا پھر ایک ہی وقت میں دونوں مراد لے لیے جائیں۔ اب اس فقرے سے چونکہ اُس خاص گروہ کو خطاب کیا گیا ہے جو اس حقیقت کو ماننے والا ہے کہ وہ حضرت نوح کی اولاد ہیں، اس لیے اس میں آخری دو احتمالات بالکل ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور واضح ہو جاتا ہے کہ ان سے صرف اور صرف نوح کی اولاد مراد لی گئی ہے۔ یہ احتمال اس لیے بھی قابل ترجیح ہے کہ خدا کو اگر یہاں دوسرے احتمال کو مؤکد کرنا ہوتا جو اس کے مخاطبین کے مسلمہ عقیدے کے بالکل خلاف ہے تو لازم تھا کہ وہ اس کے لیے کسی قطعی اور غیر محتمل اسلوب کو اپناتا، یا اسی اسلوب کو لانا اگر بہتر ہوتا تو اس کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ ضرور لاتا جس سے نوح کی اپنی اولاد اس میں سے بالکل خارج ہو جاتی۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا ہے، مگر 'يا بني إسرائيل' اور 'ذرية نوح' کہنے کے بجائے 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کا انداز اپنایا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مقام پر منشاے متکلم کو سمجھا جائے۔ پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو تورات اس تاکید کے ساتھ عطا فرمائی کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔ اس کے بعد توحید کے اسی مضمون کو مؤکد کرنے کے لیے 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کے الفاظ میں خطاب کیا اور اس طرح انھیں ایک حقیقت کی یاددہانی کرا دی ہے۔ سو کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس یاددہانی کے لیے اِس اسلوب کو اپنایا ہے کہ 'يا بني إسرائيل' یا 'ذرية نوح' کہا جاتا تو یہ مقصد بالکل بھی حاصل نہ ہو پاتا۔

اجزا کی وضاحت کے بعد اب اس مقام کا مضمون بالکل کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا نے جب بنی اسرائیل کو اپنی کتاب عطا فرمائی تو اُنھیں اس بات کی پر زور تنبیہ کی کہ وہ اُس کے سوا کسی اور کو اپنا کارساز ہر گز نہ بنائیں کہ ایسا کرنا صریح شرک ہے۔ اس تنبیہ کے لیے اُن سے خطاب بھی 'مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کے اسلوب میں کیا تاکہ وہ لوگ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ وہ حضرت نوح کے اُن اہل کی اولاد ہیں جو اس شرک سے قطعی طور پر محفوظ رہے اور انجام کار اُن کے ساتھ کشتی میں سوار کیے گئے۔ اور اس کے بعد اسی توحید کو یہ کہتے ہوئے مؤکد کیا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوح بھی ہماری بندگی کرنے والا ایک توحید پرست آدمی تھا[11]۔

۱۱۔ 'شَكُوْرًا' کی مراد ہم نے توحید بیان کی ہے، اس لیے کہ شکر گزاری کا لفظ یہاں توحید کی حقیقت کے اعتبار سے لایا گیا ہے۔

یہ اس مقام کا سادہ اور مختصر لفظوں میں مطلب ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے حسب نسب کے بارے میں کوئی نئی بات بتانے کا کہیں شائبہ تک موجود نہیں ہے۔

ان حضرات کی اس راے کے متعلق ایک بات اور بھی سامنے رہے۔ انھوں نے اس راے کو بنی اسرائیل کی تاریخ کی اصلاح کرنے والا ایک انکشاف قرار دیا ہے، اس لیے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن میں تورات اور اہل کتاب کے مزعومات کی اصلاح کرنے کا طریق کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس طریق کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

”حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تورات کا بیان یہ ہے کہ اُنھوں نے معجزہ دکھاتے ہوئے جب اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ کوڑھ سے برف کے مانند سفید تھا[12]۔ قرآن نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو بڑے ہی واضح انداز میں یہ کہتے ہوئے اس کی اصلاح کی: 'تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ'۔[13] یعنی، یہ ہاتھ بغیر کسی بیماری کے سفید ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح تورات میں بیان ہوا ہے کہ خداوند نے چھ دن میں زمین و آسمان کی تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا۔[14] قرآن نے یہ کہتے ہوئے بڑی صراحت سے اس کی تردید کی: 'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ'۔[15] کہ ہمیں کوئی تکان ہر گز لاحق نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر کوئی غلطی بہت زیادہ سنگین ہو اور لوگوں میں اس کا رواج بھی عام ہو چکا ہو اور قرآن کو اس کے جواب میں واقعتاً کوئی انکشاف کرنا ہو تو اس کے لیے وہ محض اشارے کنایے میں اور محض ضمیروں کی دلالت سے بات نہیں کرتا، بلکہ انکشاف ہی کے طریقے پر اسے بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، یہود سیدنا مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے، انجیلوں میں بھی یہی کچھ نقل کر دیا گیا تھا، اور اسے کم و بیش ہر مسیحی فرقے میں مان لیا گیا، حتیٰ کہ نزول قرآن کے وقت اسے ایک مسلمہ کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی؛ اس پر قرآن نے اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ کتنے زوردار طریقے سے بتایا ہے: 'وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'۔ اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ یعنی پہلے اُن کی بات کی ہر دو پہلو سے تردید کی

۱۲۔ خروج ۴: ۶۔

۱۳۔ طٰہٰ ۲۰: ۲۲۔

۱۴۔ خروج ۲۰: ۱۱۔

۱۵۔ ق ۵۰: ۳۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور پھر اُنھیں جہاں سے غلطی لگی تھی، اُس بنیاد کی بھی وضاحت کی۔ بلکہ پھر سے دہرا کر اصل بات کو مؤکد کیا: 'وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا'[16] کہ اِنھوں نے ہر گز اُس کو قتل نہیں کیا۔ غرض یہ ہے کہ تورات کے بیان کی تردید کرتے ہوئے قرآن کو اگر یہ بتانا ہوتا کہ وہ نوح کے بجاے کسی اور کی اولاد ہیں تو وہ اپنے معروف طریقے کے مطابق ہی بتاتا، نہ کہ اس طرح بتاتا کہ اسے جاننے کے لیے بڑے باریک اور منطقی استدلال کی ضرورت آن پڑتی۔" (ماہنامہ اشراق، نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۵)

اس وضاحت پر ان لوگوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ اس میں ہم نے جو 'مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ' اور 'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ' کی مثالیں لکھی ہیں، وہ سب کے سب کنایے ہیں۔ ہم عرض کریں گے کہ ان کی یہ بات قرآن کے کسی بھی طالب علم کے لیے بالکل ہی غیر متوقع اور حد درجہ باعث حیرت ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ کوئی تبصرہ کرنے کے بجاے اسے اہل علم کی توجہ کے لیے چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود ہی دیکھ لیں کہ یہ الفاظ تورات کی اصلاح کرنے کے لیے ہر طرح سے صریح ہیں یا صرف کنایہ ہیں۔

آخر میں ہم ایک گزارش کرنا چاہیں گے۔ مطالعہ کے دوران ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی نئی چیزیں روز ہی طالب علموں کے سامنے آئیں۔ جب بھی ایسا ہو تو عرض ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی ایک نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھیں اور "کاتا اور لے اڑی" والا معاملہ کبھی نہ کریں، بلکہ اچھی طرح سے غور و فکر کریں، ہزار مرتبہ پرکھیں اور اُنھیں خوب پختہ کریں، اور ہو سکے تو اس سلسلے میں دوست احباب سے بھی رابطہ کریں۔ ہمیں بڑی امید ہے کہ اس کے نتیجے میں اکثر چیزیں ہوا ہو جائیں گی اور درست اور محکم بات ہی باقی رہ پائے گی۔ اور اس کا یہ فائدہ بھی لازماً حاصل ہو گا کہ وہ اس طرح علم اور تحقیق کا صحیح حق ادا کریں گے اور پروردگار عالم کی کتاب کے معاملے میں ایک واجب احتیاط کا بھی التزام کریں گے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۶۔ النساء ۴: ۱۵۷۔